

اگر ان میں کا کوئی طبقہ رواداری پر آمادہ ہو تو ہم کو بھی پورے طور پر رواداری کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ مسلم اور غیر مسلم اقوام مذہبی امور کے علاوہ باقی جملہ سیاسی امور میں متحد اور متفق ہو کر ملک و اہل ملک کی بہبودی اور ترقی کے کاموں میں مصروف رہ سکیں (۱۴)۔

ملاحظات

از ایڈیٹر

میں نے ترجمان القرآن کی سابق اشاعتوں میں اسلامی مہند کے مستقبل پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسے میری قدرت بیان کا نقص سمجھیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے میں اپنا نقطہ نظر پوری طرح واضح نہ کر سکا اور اس کے متعلق فاضل مضمون نگار صیغے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فہیم و ذکی اصحاب کو بھی شبہات پیش آئے تاہم اب میں دوبارہ کوشش کروں گا کہ حالات کو جس نظر سے میں دیکھتا ہوں اسی نظر سے دوسروں کو دکھا سکوں اور مستقبل کے متعلق جس آئینے کو میں درست سمجھتا ہوں اس کے درست ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہنے دوں۔ بحث کی تسہیل کے لیے میں نے نواب صاحب کے مضمون میں قابل جواب امور پر نمبر لگا دیے ہیں، اور اب نمبر وار جواب عرض کرتا ہوں۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے؛ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسئلہ کو محض اس بنا پر روکتے ہیں کہ یہ تدابیر بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں اور ان کے حصول میں عین بھی کم ہیں۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے

جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ قوتِ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو ردِ بجا رلانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر رد کرتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف نواب صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزو کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آیا آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں۔ یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلہ پر دو بالکل مختلف و متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی نہ کو را صدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستے سے بالکل الگ ہے میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں، اس لیے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو، اس نکتہ کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقاء کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورہ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے فیصلے ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں، اور انتہا درجہ کی سنجیدگی کے ساتھ کام کریں تب بھی وہ اس توازن اور توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطہ نظر کیا لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے فرقہ دارانہ تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانی کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے۔ کیا آپ (اور آپ سے میری مراد) سب لوگ ہیں جنہیں میرے سیاسی مسلک سے اختلاف ہے، اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو یہ فرمانیے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب، اور نہ حاصل ہو تو کچھ پرہیز نہیں، اس کے بغیر آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں مڑ چکی گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان

کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں کے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں۔ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کے خطرات میں نے ظاہر کیے ہیں؟ کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں جب وطن یا حب نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کرنا چاہیے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک ان تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لا حاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان تدابیر کا جائزہ لیجئے اور غور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کونسی تدابیر ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطہ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفاکی کافی ہو کہ ”ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے“ بلکہ حقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خود کوشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہر حال انہیں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل مضمون نگار نے فائ

یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظام اجتماعی کے آخری انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہذا اس کو نامکمل وقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو نامکمل وقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدر اول کے مسلمانوں کی کسی انتہائی دین داری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو، جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لیے اجتماعی جدوجہد کر سکتی ہو، جس میں آنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچاننے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور فداکاری اس کے دائرہ میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت بچے جذبہ کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور بہم عمل پر آمادہ ہو جائے، تو ایک قلیل مدت ہی میں ایسی ایک رائے عام تیار کی جا سکتی ہے لیکن سب کچھ اس وقت ممکن ہے جبکہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں صحیح طریق کار کی دشواریوں کو دیکھ کر بہت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر

خدا نخواستہ یہی ذمہ داری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجہ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا نہیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

۲۔ یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جائیگی یا ہو جانی چاہیے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں پچھلے واقعات اور موجودات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقا کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف انجیاں افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے غلطی رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر زور و اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جو شریک جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان تہیں نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو ایک بنیاد پر مبنی بننے کی ضرورت ہے۔ لیکن صاحب مضمون کو نہ معلوم میرے کون سے الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں مسلمانوں کو بنیاد پر مبنی نہیں بنانا چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جاسکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار

دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہو گا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملا لیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہو گا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خود سری یا منافقت کی بنا پر اپنی قوم کا ساتھ دینے سے انکار کریں عالم اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ یہ بالکل برہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متنفا دراستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح جوڑ کر ایک بنیاد مرصوص نہیں بنایا جاسکتا۔

اس کے ساتھ ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور کرنا ضروری ہے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے اپنی قوم کی مندرجہ قوتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے جنگ خوردہ ہتھیاروں پر تعطل بھی ہو گا اور دوسری طرف ہماری مندرجہ قوت جتنی جتنی جمع ہوتی جائے گی ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بڑھتا چلا جائے گا اور اس کے اثرات وہی ہوں گے جو فاضل مضمون نگار کو مطلب ہیں بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ ظالم جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں اور ظالم گروہ ان سناٹا قوتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہو گا بلکہ ان کی شکست خوردگی کا ثبوت ہو گا۔

۳۔ مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں کے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جبہ

مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن بحیثیت جمہوری ان کو نقصان سے بہت زیادہ فواید حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جھڑپنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ”ہندویت“ کی اساس کسی عقیدہ اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ نسل اور مرزبوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرز معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جا ان کی ”ہندویت“ بے حال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لاسکے۔ لہذا مغرب کے عمرانی سیاسی تصورات ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں، یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی اس کا سوشل سٹم غایت صحیح و سالم تھا۔ جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام ”اسلام“ ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی۔ مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصیبت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم میں نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو ٹھن گئی اس نے اپنے سوشل سٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بھرتا

چلا گیا جو اس سٹم کا طرہ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سمجھے بوجھے قبول کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دوپہرتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے

اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی اور اس نے حکومت کے مقام سے گر کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دو ہیں جو مزید

خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں لعنیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں پر مغربی ایشیا کے اثرات اُس کے بالکل برعکس ہوئے ہیں جو آپ کو ہندوؤں میں نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرادیا، اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرہ کو جو نقصان پہنچایا وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہیں حال ہوئے۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت، کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے

ضروری سمجھتا ہوں کہ من جملہ دوسرے اسباب زوال کے، ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔ فاضل مضمون نگار نے غالباً یہ خیال کیا ہے کہ میں پرلے تعلیم یافتہ گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اور اس گروہ

کی جانب سے جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں اس لیے میری تحریروں سے ان دونوں گروہوں میں جو اختلافات ہیں وہ اور زیادہ بڑھ جائیں گے، اور تعلیم جدید کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں

اور زیادہ شدت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرا تعلق ان دونوں گروہوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے میں نے جدید تعلیم و تربیت کے تقاضوں پر جس قدر صاف کوئی کے ساتھ عقید

کی ہے، اسی قدر صاف کوئی کے ساتھ قدیم تعلیم کی کزوریوں اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات کی عقید

بھی متعدد مرتبہ تنقید کر چکا ہوں میں ان دونوں گروہوں میں تنافر نہیں بلکہ مصالحت چاہتا ہوں اور مصالحت کی صورت میرے نزدیک یہی ہے کہ ایک گروہ اپنی قدامت پرستی اور جمود کو چھوڑے اور دوسرا گروہ اہل مغرب کی اندہی تقلید سے با آئے۔

(۵) "علوم جدیدہ" اور "جدید تعلیم" کے فرق کو نظر انداز نہ کیجیے۔ میں علوم جدیدہ کی تعلیم کا مخالف نہیں بلکہ شدت کے ساتھ حامی ہوں، اور بارہا اس رٹے کا اظہار کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کے نزر کی ایک بڑا سبب ان کا جمود اور ماضی پرستی میں مبتلا ہو جانا اور تحقیق و اجتہاد کے میدان میں دوسری قومیں پیچھے رہ جانے ہیں۔ لیکن زمین اور آسمان کا فرق ہے "علوم جدیدہ کی تعلیم" اور اس "جدید تعلیم" میں جو ہمارے نوجوانوں کو دی جا رہی ہے۔ حقائق فطرت کے انکشافات، اور آثار فطرت کے مشاہدات اور مسائل عمرانیہ میں فکر انسانی کے اجتہادات نے انسانی تمدن کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ مسلمان کو مسلمان بنانے میں اور زیادہ مدد دیتے ہیں، اور اس کی ترقی کے لیے ان کی حیثیت "گزیر وسائل" کی ہے۔ لیکن جو چیز ان تمام علوم کو اسلام کے خلاف بنا دیتی ہے، اور مسلمان کو کفر و فسق کی طرف لے جاتی ہے وہ، وہ خاص مغربی نقطہ نظر ہے جو ان تمام علوم کی بنیاد بن گیا ہے، اور وہ خاص طرز تعلیم و تربیت ہے جو ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس مسئلہ پر ترجمان القرآن کی متعدد اشاعتوں میں تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔ اگر فاضل مضمون نگار ان مضامین کو ملاحظہ فرمائیں تو ان کے اکثر شبہات خود دور ہو جائیں گے (خصوصیت کے ساتھ جمادی الاخریٰ، رجب و ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ، رجب ۱۳۵۲ھ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۲ھ کے اشارات) اور جمادی الاخریٰ ۱۳۵۲ھ کی اشاعت میں وہ مضمون جو علیحدہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر لکھا گیا ہے، قابل ملاحظہ ہے۔

(۶) درحقیقت یہی کام میرے پیش نظر ہے جس کی طرف نواب صاحب نے اشارہ فرمایا ہے چند صغیاتی قبل میرے جس پروگرام کو نواب صاحب ناقابل عمل قرار دے چکے ہیں اس کا اہم ترین حصہ یہی ہے کہ ^{نوں}مسلمانوں کے طبقہ عوام میں اسلام کا کم سے کم ضروری علم پہنچا دیا جائے تاکہ وہ اپنے دین سے واقف ہو جائیں اور ان رسوم جاہلیت سے خود بخود اجتناب کرنے لگیں جو ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ان کے اندر قومی مفاد کا صحیح شعور پیدا کیا جائے، اور ان کو کم از کم اس حد تک باخبر کر دیا جائے کہ وہ قومی مفاد کی خدمت کرنے والوں اور اسے نقصان پہنچانے والوں کے درمیان امتیاز کر سکیں۔

(۷) ”سلطنت و سُلطنت“ ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود و اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدایج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اس کے مایوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گھنی زیادہ اکثریت پر حکمراں ہیں۔ ایک ڈیموکریٹک نظام حکومت میں بھی اقدار اکثریت (Majority Rule) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر بنا سکتی ہے پس یہ سوال کہ وہ ”سلطنت و سُلطنت“ جو میں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سر سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے اسی کی نسبت سے ”سلطنت و سُلطنت“ کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

(۸) ”شبہ دارالاسلام“ سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص ”دارالکفر“ کی نسبت

خاص ”دارالاسلام“ سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ ان کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں لیکن اس حدود و آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقدار کے بلا واسطہ اثر سے محفوظ نہیں رہتے انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری جوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ ان مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے، جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑ دیے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصول معیشت کی پابندی قریب قریب محال ہو گئی ہے اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو ان اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلا واسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لاسکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدار مطلق فی نفسہ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔ جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہے، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بچر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس تک کی ہو وہ اگر خاص دارالکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دارالکفر،

چاہیے نہ کہ شبہ دار الاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رہنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں، وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیار کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے، اس وقت ہم نسبتاً دیاوہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل متعین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں دُصل جائیگی اور بوری طرح مستحکم ہو جائیگی اس وقت ہمارے لیے اپنا اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں چکر لگے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفا پر قائم کر دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہو گا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دار الکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں، میض عقل عام Common Sense رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آرہی ہے، اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جانے تعجب نہیں، اس لیے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ان کا ضمیر تو پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دارا لکفر ہو یا خالص دارا لکفر، ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہئے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

(۹) اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کے بعد مجھے امید ہے کہ فاضل مضمون نگار اپنی اس رائے پر خود نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو، تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہر حال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

(۱۰) اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس ”سلطنت و سلطنت“ کا مدار ہو وہ اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

(۱۱) میں بیچ الاول صفحہ کی اشاعت میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں ”سلطنت و سلطنت“ سے میری مراد یہی حقوق اور اختیارات ہیں۔ آپ ایک مرتبہ پھر ان کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں کوئی چیز ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے

روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشو و ارتقا میں مانع ہو، اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) طلب کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور ان سب کو ایسی خود اختیاری دینے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظام حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

(۱۲) یہ وہی چیز ہے جس کی طرف میں توجہ دلا رہا ہوں۔ اسی کے لیے ضرورت ہے کہ مسلمان کو ایک نصب العین پر متحد ہوں، اپنے قومی مفاد کا ایک واضح اور متعین نقشہ ان کے درمیان متفق علیہ ہو، اور کوئی ایسا نظم ان کی جماعت میں پیدا ہو جائے جس کے تحت وہ اپنے مفاد کے لیے اجتماعی جدوجہد کر سکیں۔ یہی چیز اس وقت مفقود ہے، اور اسی کا فقدان ہماری آواز کو بے اثر بنا رہا ہے۔ اگر ہماری ایک جماعت کسی چیز کو قومی حق قرار دے کر اس کا مطالبہ کرے، اور خود ہماری اپنی قوم کی ایک دوسری جماعت اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم اپنے کسی حق کی بھی حفاظت نہیں کر سکتے اس وقت تو ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے تو دوسرے گروہ کا کچھ اور۔ ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ اس چیز کا نام ہی سن کر کہے گا کہ "کیونکہ ہم اس کا آواز کس دیتا ہے۔ صد یہ ہے کہ ہماری ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نمائندگی کے لیے اٹھتی ہے اور اس سے دس گنی جماعت بٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں کے مہم میں نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ اب اندازہ کیجئے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی ہو سکتی ہے۔ اور جب حال یہ ہے تو وہ متفقہ آواز آپ لائیں گے ہی کہاں سے جس کے بغیر آپ خود تسلیم کرتے ہیں

کوئی آئینی ضمانت اور کوئی میثاق ہمارے لیے قابل اطمینان نہیں ہے۔

(۱۳) یہی کام ہے جس کو میں چاہتا ہوں کہ اسلامی اصول پر انجام دیا جائے۔ چونکہ ہمارے سامنے صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابل اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے، بلکہ تمام ازمنہ اور امکان کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں، اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے، آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز بروقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس میں کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لاسکتی ہے جو سیرت محمدی کے حشرِ پہلے سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو اور جو لوگ انہی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفانوں میں بھی راہِ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کسی صورت ایک ایسے رہنما اور چنداے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ہوا نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام نمود کی بھوک

ذاتی وجاہت کی پیاس، مالِ زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سر بلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

(۱۴) اس کے متعلق میں تصریح کر چکا ہوں۔ جمہور اہل اسلام کی قیادت اب ان لوگوں سے چھین لینی چاہیے جو چھوٹے چھوٹے مسائل پر مسلمانوں کو بھڑکا کر ہمایہ قوموں سے لڑتے ہیں، اور قوم کی قوت کو فضول محکڑوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اب قیادت و رہنمائی کے لیے ایک ایسی ترقی پسند مسلمان جماعت کو اٹھنا چاہیے جو مشترک منہ و ستانی مفاد کے لیے اپنے غیر مسلم ہمایوں کے ساتھ کھلے دل سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو، اور ان معاملات میں کسی قسم کا فرقہ وارانہ تعصب روانہ رکھے، مگر اپنے قومی مفاد کے معاملہ میں (جس کے حدود و واضح طور پر مشترک وطنی معاملات سے الگ ہوں) کسی دباؤ، کسی لالچ، کسی پردہ پیگنڈا کی طاقت سے اس کو مغلوبانہ مصالحت کے لیے راضی نہیں کیا جاسکتا ہو۔